

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم کہتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بلا کیفیت مستوی علی العرش مانے وہ کافر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک آدمی کے سینے میں موجود ہے جس طرح حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

اللہ تعالیٰ، زمین اور آسمان کی پیمائش مت کریں صرف مسلمان مرد کے دل کی پیمائش کریں۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر نہیں ہے بلکہ ہر ایک آدمی کے سینے میں ہے آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ یتواہل بلیل توجروا بآجر الجلیل۔

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ، والصلوة والسلام علی رسول اللہ، أما بعد!

قرآن کریم میں کتنی ہی جگہوں پر اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا ثابت ہے مثلاً سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتِّ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الاعراف: ۵۴)

"بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔"

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتِّ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (النس: ۳)

"بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔"

لَهُ لَدَىٰ رَفِيعٍ ثَنُوبٌ بَغِيرِ عَوْدِ ثَوْدَانَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الرعد: ۲)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنہیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

الزخرف علی العرش استوی (ط: ۵)

"وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔"

لَدَىٰ خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَمَا يَتَّبِعَانِي سِتِّ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الفرقان: ۵۹)

"وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔"

لَهُ لَدَىٰ خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَمَا يَتَّبِعَانِي سِتِّ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الجمہ: ۴)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتِّ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (الحدید: ۴)

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا واضح طور پر ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوی اس کی صفت ہے اور اللہ کی صفات کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور سلف صحابین کا یہی مسلک ہے (یہی مسلک اصح اور اسلام ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جو قرآن کریم سے اور صحیح احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہیں ان کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کی لغوی معنی تو ہمیں معلوم ہے لیکن ان کی کیفیت کے بارے میں نہ ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ یا وسیلہ ہے جس کی بنا پر ان کی کیفیت معلوم کر سکیں۔ یہ مسلم قانون ہے کہ صفات ذات تابع ہوتی ہیں جب کہ اللہ جل و علی شانہ کی

ذات پاک بے مثل ہے تو اس کی صفات بھی بے مثل ہوں گی، خالق اور مخلوق کی صفات میں صرف لفظی اشتراک ہے باقی معنی اور مفہوم کے لحاظ سے مخلوق کی صفات اس بے مثل ذات پاک کی صفات سے کوئی اشتراک نہیں رکھتی مثلاً انسان کو بھی سمجھ اور بصیرت کہا گیا ہے جس طرح سورۃ الدہر کے اندر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا عَلَّمْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْقٍ أَمْشَاجٍ بَشِيرٍ فَمَلْحَمَةٍ سَمِيَةٍ بِبَصِيرَةٍ (الدر: ۲۰)﴾

”یعنی انسان کو بھی سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا گیا ہے۔“

اور ہاں ”سمجھ اور بصیرت“ اللہ تعالیٰ کی بھی صفات ہیں مگر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورہ شوریٰ کے اندر فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوری: ۱۱)﴾

”کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا بے مثل ہے۔“

یعنی سننے اور دیکھنے میں ہماری طرح آنکھوں اور کانوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہی حکم اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات کا ہے۔ مثلاً اللہ کا کلام کرنا، اللہ کا غضب اور رضا مندی، بندوں سے محبت کرنا ان پر غصہ کرنا۔

یہ (ہاتھ) عین (آنکھ) و غیرہ (چہرا) وغیرہ تمام کو ویسے ہی مانتا ہے جس طرح کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے۔ نہ کہ ان کے اندر تاویل کی جائے گی اور نہ ہی ان کا معنی مفہوم ایسا لیا جائے گا جو مخلوق سے مشابہت کی طرف فتح ہو، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات بھی مشابہت کے باب سے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مشابہت کے نزول اور بیان کا آخر مقصد کیا ہے کہ ہم انسانوں کو ان کے پورے مفہوم اور کیفیت کا علم ہی نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت صرف اس کی صفات کے علم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے، مثلاً کسی ملک کا بادشاہ ہو یا دوسری کوئی بڑی ہستی ہو وہاں تک لوگوں کی رسائی نہ ہو اور اس کے متعلق واقفیت صرف اس کی صفات سے ہو سکتی ہو، یعنی ہمیں علم کے صحیح ذرائع سے معلوم ہو کہ وہ بادشاہ عدل و انصاف والا ہے، اپنی رعیت پر رحم کرنے والا ہے، ان کی تکالیف پر خیر گیری اور مدد کرنے والا ہے، وغیرہ وغیرہ تو اس کی ان خوبیوں کی اعلیٰ صفات کی معرفت سے ہمیں اس کے بارے میں کافی حد تک صحیح علم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ عوام جس کو اپنے اس بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں ان کے دل میں بھی یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ جب رحم دل اور عدل و انصاف کا علم دار ہے ظلم و زیادتی سے کنارہ کشی کرنے والا ہے تو ہماری مشکلات کی اگر اس کو اطلاع ہوگی تو ضرور ہماری مدد کرے گا اور مشکل وقت میں ضرور ہمارے کام آئے گا، اس کی ان خوبیوں اور کمالات کو مد نظر رکھ کر لوگ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو کہ پوری مخلوق کا خالق و مالک اور حقیقی بادشاہ ہے جس نے اپنے بندوں کو آزماتے کے لیے اس دنیا میں مبعوث کیا اور اسی امتحان کی خاطر انہیں حکم کیا کہ وہ ان دیکھے ان پر ایمان لائیں غیب پر ایمان لائیں یہی وجہ ہے کہ اس دنیا فانی کی مخلوق اس فانی دنیا میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی اور انسان جس چیز کو نہیں دیکھ سکتا آخر اس کے ساتھ تعلق کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ کس چیز کے ساتھ کسی کا تعلق یا تو اس کے حسن و جمال خوبیوں اور کمالات کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یا اس کی صفات حمیدہ اور اس کی بے شمار خوبیوں کے علم حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے اس لیے ان سے تعلق قائم کرنے کی صرف واحد صورت یہی بچتی ہے کہ ہمیں ان کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کا علم ہو جائے پھر جب بندے کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ہمارا رب اللہ خالق بھی ہے مالک بھی ہے تمام مخلوق کی پرورش بھی کر رہا ہے ان کو رزق بھی دے رہا ہے، عدل و انصاف والا ہے، کسی پر ڈرے برابر بھی ظلم نہیں کرتا، بندوں پر رحم کرتا ہے ان سے محبت کرتا ہے اور ان کی فریادرسی بھی کرتا ہے جب بھی اس کو پکارا جائے تو پکار کو سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے رات کے آخری حصہ میں دنیا آسمان پر نازل ہو کر بندوں کو پکار پکار کر کہنے لگتا ہوں اور خطاوں کی معافی طلب کرنے کا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری صفات حمیدہ کے علم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بندہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اتنی محبت ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے اتنی محبت نہیں ہوتی، قرآن کریم سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ هُمْ أَكْثَرُ (البقرۃ: ۱۶۵)﴾

”اور جو ایماندار لوگ ہیں وہ تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔“

اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ سے بے انتہا محبت ہے اور یہ اتنی بڑی محبت یہ تعلق ورثہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کے علم کا نتیجہ ہے۔

سورۃ ذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَعَلَّمْنَا الْحَيَّ وَالْإِنْسَانَ وَالْإِنْسَانِ وَالْإِنْسَانِ (الذاریات: ۵۶)﴾

”کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔“

اور ظاہر ہے کہ کسی کی عبادت اس کی معرفت کے بغیر تصور میں نہیں آ سکتی، تو اگر بندوں کو رب کی صفات کا علم نہ ہوتا تو اس کی عبادت کس طرح کر سکتے تھے۔ ہمیں وہ غیر نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیا ہے درپردہ گویا اللہ سبحانہ و تعالیٰ معاذ اللہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یا کوئی مستقل ہستی نہیں ہے کیونکہ انسان جو مشاہدات اس دنیا میں کرتا ہے جن کا تعلق چاہے جمادات یا نباتات کی اقسام سے ہو یا حیوانات تک باب سے حیوانات سے مراد جاندار اور چیزیں ہیں۔ ان تمام کی کچھ نہ کچھ صفات ہیں موجودات میں سے کوئی بھی چیز صفات سے عاری نہیں ہے پھر اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت ہی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ ایک مہموم چیز ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کفریہ عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظوں میں یوں سمجھیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار ہی ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار ہی ہے۔ خلاصہ کلام کل بندوں کو اللہ کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور اس علم کے ذمے ان کے دل اور دماغ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق صحیح یقین اور تصور قائم ہو سکے کہ میری یہ عبادت اس ذات پاک جل و علیٰ کے لیے ہے جس کی یہ صفات ہیں اور اس سے یہ یقین قائم ہو گا کہ میں کسی مہموم چیز کی بندگی نہیں کر رہا بلکہ ایک ایسی ہستی کی بندگی کر رہا ہوں جو خود بھی موجود ہے اور دوسری مخلوق کو بھی قائم رکھے جو کہ ان صفات کمال سے متصف ہے، اور صفات دو قسم کی ہیں۔

(1) صفات ثبویہ (2) صفات سلبیہ

ان دونوں صفات کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح تصور قائم ہو سکے، صفات ثبویہ سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی ہستی میں موجود ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا غفور، رحیم، شکور، ودود، عادل ہونا اس قسم کی تمام صفات ثبویہ ہیں۔ اور وہ صفات جن کا تعلق عیوب، نقائص، عجز و کمزوری، ظلم و ناانصافی وغیرہم سے ہو اس طرح کی صفات جس میں پائی جائیں وہ اس کے عیوب میں شمار ہوں گی، لہذا جس طرح صفات جلال و کمال کی اثبات اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے اس طرح ذات جل و علی سے ان تمام صفات کی نفی بھی ضروری ہے جو نقض و عیوب پر دلالت کرنے والی ہوں۔ اس کی صفات جلال و جمال کے خلاف ہوں، ایسی صفات کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے مثلاً سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (الاخلاص: ۴)

”یعنی اس کا کوئی ثانی یا برابر ہی والا نہیں ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام نقائص او عیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے اندر موجود ہیں جس طرح سورہ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوریٰ: ۱۱)

”اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔“

لیکن اس کا سننا اور دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا سمیع اور بصیر ہونا بے مثل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت میں ہر اس صفت کی نفی کی گئی ہے جس میں ذرہ برابر نقض یا عیب کی بو آتی ہو۔ اب خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور عبادت صحیح نمونے پر اس وقت ہو سکے گی جب مہمود کا دل میں صحیح تصور قائم ہو یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کبریائے اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات کا ذکر کیا ہے جن کی معرفت سے اللہ کے بارے میں جتنا علم ہو سکے وہ ہو جائے۔ اب آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ مشابہات جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات بھی شامل ہیں ان کو اللہ نے کیوں بیان فرمایا ہے مثلاً بندوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے، اس لیے کہ بندے یہ جان لیں ان کا رب ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور ہماری تمام دعائیں سن رہا ہے اور وہ مشکل کشا بل و علی اپنے فضل و کرم سے ان کی دعا کو قبول کرے اور اس مشکل سے اس کو نجات دلائے۔ اسی لیے انہیں بتایا گیا کہ

اللہ تعالیٰ غفار، غفور وغیرہ ہے اس لیے اگر بندوں سے خطائیں اور غلطیاں ہوں تو وہ مایوس بالکل نہ ہوں بلکہ ان کے دلوں میں وہ یقین اور امید باقی رہے کہ ہمارا مالک وحدہ لا شریک لہ ہے ہر حال بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے۔ اس لیے ہم اگر اس کی طرف رجوع کریں گے اور توبہ تائب ہوں گے تو وہ ضرور ہمیں اپنی مغفرت اور رحمت واسعہ سے نوازے گا۔

اسی طرح دوسری صفات ثبویہ کو سمجھنا چاہئے۔ کتاب و سنت میں ہمیں چند کلمات سکھائے گئے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہمیں کافی اور شافی علم عطا کرتے ہیں جن کے پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے وہ کلمات یہ ہیں۔ ”سبحان اللہ“ اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ سے ہر عیب و نقض اور خامی کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی یہ لفظ صفات سلبیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے مگر کسی عیب کی صرف نفی اس کی معرفت کے لیے کامل نہیں ہوتی۔ مثلاً جس طرح کہا جائے کہ فلا شخص یا بادشاہ اندھا نہیں ہے یا لنگڑا نہیں ہے۔ کا نہ یا بصورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن عیوب کی نفی کے باوجود سننے والے کے دل میں ابھی تک تشنگی باقی رہتی ہے لیکن جب اس صفات کو ثبوتیہ کا علم ہو جائے تو پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اس ہستی کے بارے میں کما حقہ معرفت حاصل ہو گئی ہے اس لیے سبحان اللہ کے بعد الحمد للہ کا کلمہ سکھایا کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی صفات حمیدہ اور کمالات کا صاحب ہے کہ جس کی وجہ سے وہ واقعتاً اور حقیقتاً ہر چیز کی حمد و ثنا و تعریف کا اہل ہے اس کے بعد تیسرا کلمہ اللہ اکبر ”کا سکھایا گیا ہے کہ انسان کو صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کے علم حاصل ہونے کے باوجود اس کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ خیالات، تصورات اور وہم گمان سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا ایمان و ایقان مزید پختہ ہو جائے کیونکہ کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ کے اندر یہ درس ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات حمادات و کمالات میں دوسری کوئی ہستی شامل شریک نہیں ہے بلکہ وہ اکیلا ہی معبود برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے باقی سارے اس کی مخلوقات میں سے ہیں جن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ جب معلوم ہوا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے لیے اس کی صفات کا علم ضروری ہے اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا بھی اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے بندوں کو آگاہ کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ ان کو اس بات کا علم ہو سکے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ان سے لائق نہیں ہوا ہے بلکہ جس طرح کوئی بادشاہ تخت بادشاہی پر بیٹھ کر اپنی حکومت چلاتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر اس کائنات کے کارخانے کو چلا رہا ہے اور دنیا کی ہر چیز پر اس کی نظر ہے۔ آسمان و زمین کو اسی نے تمام ہوا ہے۔ جس طرح سورت فاطر میں فرماتے ہیں:

إِنَّ لِلَّذِيكَ لَسْمُوتٌ وَ لَأَرْضٌ أَنْ تَوَلَّوْا (طہ: ۴۱)

”اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو روکا ہوا ہے تاکہ اپنی جگہ سے مل نہ سکیں۔“

اسی طرح سورہ ملک میں فرماتے ہیں:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ عِظْرِ فُؤَادِهِمُ صَدَّبَتْ وَيَفْخِضْنَ يَا حَيْهَاتُ لِلَّهِ رِزْقُهُمْ إِنَّهُ بِعَيْنَيْهِ بَصِيرٌ (ملک: ۱۹)

”یعنی کیا یہ انسان نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین کے بیچ میں جو پرندے صفتیں بنا کر اڑتے ہیں اور پہرے لپٹنے پر ان کو بند بھی کرتے ہیں ان پرندوں کو فضا کے اندر صرف رحمن ہی نے روکا ہوا ہے بے شک وہ وہی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔“

یہ صرف پرندوں کی مثال نہیں ہے بلکہ اس کی ہر چھوٹی بڑی اور جاندار اور بے جان چیز پر نظر ہے کوئی لہجہ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی مخلوق سے غافل رہتا ہو۔ نہ اس کو بند آتی ہے اور نہ ہی او گھرا واپلنے عرش سے ہی پورے کائنات

کا نظام چلا رہا ہے اور ان کے تمام امور میں تدبیر کر رہا ہے۔ جس طرح سورہ الم سجدہ میں فرماتے ہیں :

يَوْمَ لَا تَجِدُ لِكُنُودٍ إِنَّمَا تَجِدُ اللَّهَ الْعَظِيمَ (الم سجدہ: ۵)

یعنی ان کافروں سے تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی پوچھو گے کہ اس کائنات کو کون چلا رہا ہے۔

تو جو جواب دیں وہ جواب بھی مذکور ہے۔

فَيَسْأَلُونَ اللَّهَ (يونس: ۳۱)

یعنی وہ جواب دیں گے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔

سلفت صالحین کا یہ عقیدہ ہے جو کہ صحیح اور اسلم بھی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر پوری کائنات کو چلا رہا ہے اگر وہ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے لیکن اس کا علم اور قدرت ہر جگہ موجود ہے اور مخلوق کے ذرے ذرے کو بھی جانتا ہے۔

وَقَدْ عَلِمْتُمُ اللَّائِيْنِ وَمَنْ يُكَلِّمُهُمْ بِالْغَيْبِ يُكَلِّمُهُم بِالْإِنْسَانِ (ق: ۱۶)

یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔

إِنَّ عِلْمَ الْيَوْمَاتِ الْعَذْوَرِ (الملك: ۱۳)

بے شک وہ سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔

سورہ آل عمران میں فرماتے ہیں :

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبِ قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (آل عمران: ۵)

بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی چیز چھپا ہے وہ آسمان ہوا زمین میں مخفی نہیں ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے باوجود اس کا علم و قدرت ہر جگہ موجود ہے، کوئی بھی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ذہن میں رکھنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتیں بے مثل ہیں۔ یعنی عرش پر مستوی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ کسی بنائے ہوئے تخت پر بیٹھ کر بادشاہی چلاتے ہیں عین اسی طرح اللہ کے لیے بھی کوئی تخت ہے جس پر وہ بیٹھ کر وہ بادشاہی چلاتا ہے۔ اس طرح ہرگز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے متعلق یا اس کی کیفیت کے متعلق ہمیں کوئی بھی علم نہیں ہے صرف اتنا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے عرش عظیم کو پیدا کیا جس کے لیے ضروری تھا وہ اس کی شایان شان و عظمت و کبریائی کے مطابق ہو باقی اس پر اس کی ستوی کیفیت یہ بے مثل ہے کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور ذات اور صفات کے اعتبار سے کوئی بھی اللہ کے مثل یا نظیر نہیں بن سکتا۔

خلاصہ کلام کے اللہ تعالیٰ کا ساتوں آسمان کے اوپر عرش عظیم پر مستوی ہونا بے مثل ہے جس کی کوئی بھی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی ہاں اس کی قدرت و علم ہر جگہ موجود ہے اس کے برخلاف جمہیر، معتزلہ، خوارج اور اشاعرہ یا متطہمین میں سے جو ان کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں انہوں نے استوی میں تاویل کی ہے اور اسے مجاز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ استوی علی العرش کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہوا یا عرش اس کے قبضے و قدرت میں ہے۔ جس کی دلیل پر وہ ایک شعر بھی پیش کرتے ہیں کہ

”استواء بشر علی العرانی من غیر سیوت اودم مہراق“

یہاں پر استواء بمعنی استولاع ہے۔ یعنی غالب ہوا، شعر کی معنی ہے بشر غالب ہوا عرانی پر بغیر تلوار چلائے ہوئے اور بغیر خون بہائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استوای کا لفظ کبھی تو بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَلَّمَهُمْ مِمَّا تَبَى اللَّهُ (قصص: ۱۴)

اور جب وہ پہنچا طاقت کو اور طاقت تمام کو۔

کبھی یہ ”الی“ اور ”علی“ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ”الی“ کی مثال

قرآن کریم میں :

(۱) : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقْوَاهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (البقرہ: ۱۹)

(۲) : ثُمَّ سَوَّيْتُمُوهَا لِلنَّارِ وَالنَّارِ لِلنَّارِ (م السجدہ: ۱۱)

سلسلہ کا اجماع ہے کہ یہاں پر اس کی معنی علو و ارتفاع ہے اور "علی" کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

مثال نمبر ۱: قَسْوًا عَلٰی ظُنُوْرٍ (الزخرف: ۱۳)

"تاکہ تم ان جانوروں کی پٹھ پر پٹھ کر (سواری کرو)۔"

مثال نمبر ۲: وَ سَتَوْتِ عَلٰی نُجُوْمٍ (هود: ۴۴)

"یعنی نوح کی کشتی جو دی پہاڑ پر آکر کھڑی ہوئی۔"

اس طرح کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں ان تمام سے علو، ارتفاع اعتدال یعنی بلند ہونا، برابر ہو کر بیٹھنا مراد ہے جس پر اہل لغت کا اجماع ہے جب استوی کا صلہ "علی" آئے تو ہر جگہ پر معنی بلند نہ ہونا مراد ہوگی جس طرح استوی علی العرش میں ہے۔ تو استوی کو اپنے معنی سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟ مجاز والی بات قطعاً درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجاز وہاں پر مراد لیا جاتا ہے جہاں پر حقیقت متعذرہ ہو، یہاں حقیقی معنی ہرگز متعذرہ نہیں ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ حقیقی معنی میں مخلوقات کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے تو یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ "استوی علی العرش" اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ویسے ہی ہے مثل ہیں جیسے اس کی ذات لے مثل ہے اور مجازی معنی مراد لینے کی دوسری صورت اس وقت پیش آئے گی جب مجازی معنی والے الفاظ دوسری جگہوں پر زیادہ آئے ہوں ایک یا دو جگہوں پر ایک لفظ آیا ہو جس کے حقیقی معنی ان زیادہ الفاظ کے مخالف ہو پھر ان متعدد مواضع کو مد نظر رکھ کر ایک جگہ پر وارد لفظ کو بھی ان پر محمول کیا ہے لیکن یہاں پر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استوی کی معنی استعلاء یا غلبہ اس کی حقیقی معنی نہیں ہے بلکہ معنی ہے لہذا "استوی علی العرش" کو اس مجاز معنی پر محمول کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب قرآن کریم میں متعدد بار استولاع علی العرش کے الفاظ آتے ہیں اور پھر ایک دو جگہوں پر "استوی علی العرش" کے الفاظ آتے تو پھر ہم اس کی معنی "استولاع علی العرش" کرنے کے مجاز ہوتے لیکن قرآن کریم میں "استولاع علی العرش" کے الفاظ ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس "استوی علی العرش" کے الفاظ ایک دو کیا بلکہ سات آیات میں وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں کرچکے ہیں۔ لہذا "استوی علی العرش" کی معنی "استوی لای" کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور دوسرا استولاع اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز پہلے قبضہ میں نہیں تھی اس پر غلبہ حاصل کر کے اپنے قبضہ میں کیا جس طرح مذکورہ شعر کا مطلب وہ حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ بشر کے قبضہ سے عراق پہلے باہر تھا پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کے معنی اللہ تعالیٰ کے قبضے اور قدرت سے ایک لمحہ بھی باہر نہ تھی نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکے گی اس لیے استعلاء اور غلبہ کا مطلب یہاں پر سراسر بے معنی ہے اور دوسری بات کہ عرش تو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پہلے سے موجود تھا جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَبُوْءِ نٰدٰی فَلَئِنْ لَّمْ يَنْزِلْ فِي سَمٰوٰتٍ وَّ اَرْضٍ وَّ اَنْجٰمٍ وَّ لٰكٰنَ عَرْشُهُ عَلٰی لَمَآءٍ (مود: ۷)

"اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اس حال میں کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔"

عربی گرامر کا قاعدہ ہے کہ کسی جملہ میں جو حکم ہے وہ اگر جملہ حالیہ کے واو کے ساتھ مقید ہے تو وہ جملہ حالیہ اس حکم یا خبر سے پہلے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جائے "جاء زيد و هو راكب" یعنی زيد آیا اس حال میں کہ وہ سوار تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زيد کے آنے سے پہلے ہی اس کے ہونے کی اس جملہ میں دلالت ہے، اس طرح اس آیت کریمہ کا بھی یہی مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے ہی عرش پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت عرش پانی پر تھا اگر عرش پہلے سے موجود تھا تو اللہ تعالیٰ نے یوں کیسے فرما دیا کہ:

هٰذَا يَوْمَ تَلْقٰى السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ فِي سَمٰوٰتٍ وَّ اَرْضٍ وَّ اَنْجٰمٍ وَّ اَنْجٰمٍ عَلٰی الْعَرْشِ (الحديد: ۴)

"وہ ذات جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔"

وغیر ہا میں الایہ کیونکہ "ثم تراخی" اور ترتیب کے لیے آتا ہے۔ اگر یہاں پر استوای سے مراد استولاع لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد عرش پر غلبہ حاصل ہوا۔ حالانکہ قرآنی نص اور بخاری وغیرہ کی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش، زمین و آسمان سے پہلے پیدا ہو چکا تھا، جس پر پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو غلبہ اور قبضہ حاصل تھا تو اگر استولاع کے معنی کرو گے تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے بعد اس پر غلبہ حاصل ہوا ہے یہ صریح تناقض ہے جس سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَوْ كٰنَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ لَلَّذِيْذِ وَا فِيْهِ خِلَافٌ كَثِيْرٌ (النساء: ۸۲)

"یعنی اگر قرآن مجید اللہ کی کلام نہ ہوتی تو اس میں بہت زیادہ اختلاف و تناقض دیکھنے میں آتا۔"

لیکن اگر اس کا معنی یہ کیا جائے کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا تو اس معنی سے کوئی خرابی نہیں آتی۔ یعنی عرش عظیم کی تخلیق تو پہلے ہی ہو چکی تھی مگر اس پر استواء زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور تناقض و تعارض کا شائبہ ہی ہے۔ "فلینا مل متلون" باقی جو شعر پیش کیا گیا ہے اولاً تو اس کے قائل کا کوئی پتہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ عربوں کے کسی دیوان میں ملتا ہے اس کے باوجود اس شعر میں ایک آدمی کا عراق پر غلبہ کا ذکر ہے اور یہ اس لیے بات صحیح ہوسکتی ہے کہ کوئی ملک کسی کے قبضہ میں نہ ہو پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے قبضہ میں لے آتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ معنی قطعاً درست نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ اس کی قدرت سے کوئی بھی چیز پہلے یا بعد میں باہر نہیں ہوسکتی، اس لیے اللہ کا عرش پر مستوی ہونا اس معنی کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا کہ عرش اس کے قبضہ میں نہیں تھا پھر اس پر غلبہ حاصل ہوا۔ لہذا "اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا" کی صحیح معنی وہی ہے جو لغت عرب کی رو سے تباور ہے جس کی مثال پہلے ذکر کرچکے ہیں وہی معنی ہے جس کو صحابہ بنا یعنی، تسبیحنا یعنی اور سلسلہ صاحبین نے ان الفاظ سے سمجھی ہے۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ پیش کردہ شعر میں استوی بمعنی استعلاء کے نہیں ہے بلکہ اس کی وہی اصلی معنی ہوگی وہ اس طرح کہ بشر جو کہ عبد الملک بن مروان کے بھائی تھے اور وہ عراق کے امیر تھے۔ سابقہ امراء بادشاہوں اور حاکموں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی ملک کی بادشاہی کے لیے آتے تو وہ اپنے تخت شاہی کے اوپر آکر بیٹھتے تھے۔ اسی طرح یہ بشر بھی عراق کا امیر بننے کے بعد اپنے تخت پر مستوی ہو کر بیٹھ گیا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے اس لفظ کو اپنی اصلی اور حقیقی معنی سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی بہر حال یہ شعر ہرگز حجت نہیں ہے کہ "ثم استوی علی العرش" کے معنی استولاع یا غلبہ ہے جب کہ اس جگہ حقیقی معنی متعذرہ نہیں ہے تو پھر مجازی معنی کی طرف

جانا اصولاً غلط ہے قرآن کریم میں لکھتے ہی مقامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام مخلوق سے بلند ہے اور انسانی فطرت بھی یہی بتلاتی ہے مثلاً جب بندہ دعا مانگتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے۔ بنی کریم ﷺ دعائے استسقاء کے اندر ہاتھوں کو اتنا بلند اٹھاتے تھے کہ بگلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اگر اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہوتے تو پھر ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ وہ کام ہی فضول بن جاتا، اس طرح صحیح حدیث کے اندر آتا ہے کہ ایک شخص اپنی لونڈی کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے کر آیا جو کہ رقبہ مومنہ کو آزاد کرنا چاہتا تھا آپ نے اس لونڈی سے سوال کیا "ابن اللہ" اللہ کہاں ہے؟ تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو یہ مومنہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ آسمان کے اوپر نہ ہوتے تو آپ ﷺ ہانڈی کے اشارہ کو کس طرح بحال رکھتے اور کس طرح اس کو مومنہ قرار دیتے؟ اللہ کے رسول سے بڑھ کر کس کو اللہ کے بارے میں معرفت ہو سکتی ہے۔ حجۃ الوداع والی حدیث تو بالکل مشہور ہے جس میں آپ ﷺ نے لوگوں کو چند باتیں پوچھنے اور سمجھانے کے بعد ان سے سوال کیا کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تو سب نے جواب دیا یہاں! آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے اپنی انگلی مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ "اللہم اشہد" اے اللہ اس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر اللہ کے لیے علو نہ ہوتا بلکہ وہی ہر جگہ بذات خود موجود ہوتا تو آپ اپنی انگلی آسمان کی طرف نہ اٹھاتے۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں رات کے آخری حصہ میں دینائے آسمان پر اللہ تعالیٰ کے نزول کا ذکر موجود ہے اگر اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش عظیم پر نہ ہوتے تو نزول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باقی ان صفات کی کیفیت کے بارے میں کوئی علم ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے اس لیے اس میں تاویلات وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم اعلان کرتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا فَعَلَ بَعْضٌ بِعَلْمٍ (بنی اسرائیل: ۳۶)

"ایسی بات کے پیچھے مت پڑو جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔"

کتاب وسنت میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات وارد ہیں ان پر اسی طرح ایمان لانا ہے جس طرح وارد ہوئی ہیں۔ باقی کیفیات کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ باقی قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے:

وَيَوْمَ نَحْكُمُ أَنتُمْ بَأْسَكُمْ (اصحیہ: ۴)

اور اسی طرح سورہ مجادلہ میں ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَلْعَنُ بَنِي إِسْرَائِيلَ بَأْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَئِن لَّمْ يَظْهَرْ عَلَيْكُمْ إِذْ هُمْ يَدْعُونَ أَنَّهُمْ يُصَلُّونَ وَاللَّهُ يَخْتَصِمُ بِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِئْتَانًا يَلْعَنُ اللَّهُ الْفَاسِقِينَ (المجادلہ: ۷)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ علم اور قدرت کے لحاظ سے ہمارے ساتھ ہے، یعنی وہ ہم سے علو شان کے لحاظ سے بہت بلند اور عرش عظیم پر ہونے کے باوجود ہماری ہر نقل و حرکت کا علم رکھتا ہے۔ خود اسی سورہ مجادلہ کے بارے میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوتی تھی، فری بی صاحبہ کا گھر مسجد سے متصل تھا کبھی میں کہ میں سنتی ہوں کہ عورت آپ ﷺ سے اتنی بلکی آواز میں گفتگو کر رہی تھی کہ میں نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن پاک ہے وہ ذات مبارکہ جو ہر وقت دنیا کی آوازوں کو سنتی ہے اس نے ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش عظیم پر اس عورت کا محاورہ سن لیا۔ اور فوراً وحی بازل کر کے اس عورت کے مسئلہ کو حل کیا اور اس کی شکایت کو دور کیا۔ جیسا کہ سورت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

فَدَسَّحُ اللَّهُ قَوْلَ نَجِيٍّ جَبَلِيٍّ فِي زَوْجَاهُ فَصَحَّحِي بِلِي لَدَّهُ لَدَّ نَسِيخُ تَمَازُؤَكَ إِنَّ لَدَّ سَمِيحٌ بَصِيرٌ (المجادلہ: ۱)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لیا اس عورت کا قول جو اپنے فائدہ کے بارے میں شکایت کر رہی تھی اللہ تعالیٰ آپ دونوں کی گفتگو کو سن رہا ہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

بہر حال اللہ تعالیٰ کی معیت کا مطلب جو ہم نے لیا ہے وہی مستفاد طور پر سلف صالحین سے مستقول ہے باقی اللہ تعالیٰ ہر جگہ باعتبار ذات موجود ہونے کا عقیدہ یا حلولیہ، زندیقین کا ہے یا متاخرین، متکلمین اور آج کل کے دہ بندی حضرات کا ہے جو کہ سلف صالحین کے عقیدے کے برخلاف ہے۔ قرآن کریم میں تو حیل قبلہ کے بارے میں ہے:

فَدَرَزِي تَقَبُّبٌ فِي نَمَارٍ فَهَوَّلَكَ تَجْوَدُ تَرْبِنَا (البقرة: ۱۴۴)

"بے شک ہم آپ کے بار بار ہجرہ آسمان کی طرف کرنے کو دیکھ رہے ہیں پھر ہم ضرور اس قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کریں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔"

بنی کریم ﷺ بار بار آسمان کی طرف کیوں دیکھتے تھے؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ چونکہ وحی آسمان سے نازل ہوتی تھی آپ اس شوق میں بار بار اوپر دیکھتے کہ کب وحی نازل ہوتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کی، اور وحی کا اوپر سے نازل ہونا اس حقیقت پر واضح دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور وہیں سے وحی کو نازل کرتا ہے تو خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر سے اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

عَلَّ زَفْرَهُ لَدَائِيهِ (النساء: ۱۵۰)

"مگر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو اپنی طرف اٹھایا۔"

احادیث صحیحہ جو کہ تواریخ حدیث پہنچ چکی ہیں ان میں اس کی تفسیر اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اٹھایا اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر نہ ہوتے تو یوں کس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھایا، آخر میں اتنا عرض کریں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ حاضر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں یا اس کے قائل ہیں تو ان کے اس قول سے یہ بات لازم آئے گی کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ، بیت الخلاء، گندی جگہیں، بد اخلاقی کے محلات اور شراب و زنا کے اڈوں میں موجود ہیں۔ اور پھر اس کے قیام میں جو خرابی لازم آئے گی اس کی سنگینی کوئی بھی عقلمند انسان بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت مروی ہے جو کہ مسند احمد، ابن ماجہ، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر کی تفاسیر اور عثمان بن سعید دارمی ابن کتاب "الرد علیٰ بتر المرئیس" میں لائے ہیں جس کو امام بخاری اپنی صحیح کے

اندر کتاب التوحید کے عنوان کے ساتھ تعلیقا جزم کے صیغہ سے ذکر فرمایا ہے۔ یہاں پر ہم امام احمد کے الفاظ نقل کرتے ہیں :

((عن عائشة رضي الله عنها قالت اخبرني رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله عز وجل قد سمع لادقن نقي شحكت في زججا)) سند احمد رقم الحديث ٣٤١٩٥ ابن ماجه في المعجم الصغير رقم ١٨٨٨ .

”تعریف اس پاک ذات کی جس کا سماع تمام آوازوں سے کثادہ ہے البتہ تحقیق ایک عورت آئی جو کہ نبی ﷺ کے مجادلہ کرنے والی تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ محو گشتی تھی اس حال میں کہ میں گھر کے اندر موجود ہونے کے باوجود سمجھ سکی کہ وہ کیا کنا چاہتی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے قد سمع لادقن والی آیات نازل فرمائیں۔“

اور ابن ابی حاتم کی تفسیر میں اس طرح کے الفاظ ہیں :

((بتبارک الدمی اوعی سمع کل شیئی انی لاسمع کل ام خولہ بنت ثعلبہ وسعنی علی بعضہ وسعی سمعنی زوجہ الی رسول اللہ ﷺ الی اخرہ))

”یعنی برکت والی ہے وہ ذات جس کا کان ہر چیز کو سمجھتا ہے بیشک میں خولہ بنت ثعلبہ کا کلام سن رہی تھی اور کچھ میرے اوپر غصی رہا اور وہ نبی ﷺ کے پاس پہنچنے کا وقت کی شکایت کر رہی تھی۔“

امام دارمی اپنی کتاب ”الرد علیٰ بتر المرئیس“ میں صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ :

((قبض رسول اللہ ﷺ قال اخبرني رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله عز وجل قد سمع لادقن نقي شحكت في زججا))

”جب نبی ﷺ نے اس دنیا سے رخصت فرمائی تو اس وقت سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : اسے انسا لو! اگر تمہارے معبود محمد ﷺ تھے تو بیشک وہ فوت ہو چکے اگر تمہارا معبود اللہ ہے جو کہ آسمان میں ہے تو وہ فوت نہیں ہوا ہے۔“

امام دارمی اسی کتاب کے اندر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے روایت نقل کرتے ہیں کہ :

”عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کی وفات کے وقت آئے تو انہوں نے اس وقت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں چند باتیں کہیں ان میں سے یہ بات بھی تھی کہ :

((واذل الله براك من فوق سبع السموات وجاء به الروح الامين))

”یعنی اللہ تعالیٰ نے تیری براءت ساتوں آسمانوں کے اوپر سے نازل فرمائی جس کو روح الامین جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے۔“

اسی کتاب میں امام دارمی صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا :

[(ما بين السماء والنيا والحق فيما مسره خمس مائة وثمانون الف سنة من السماء السابعة و بين العرشين خمس مائة وثمانون الف سنة من السماء السابعة و بين العرشين خمس مائة وثمانون الف سنة من السماء السابعة و بين العرشين خمس مائة وثمانون الف سنة من السماء السابعة و بين العرشين خمس مائة وثمانون الف سنة من السماء السابعة) (بحوالہ الدرر الثمور جلد ١ ص ٩٢)]

”آسمان دنیا اور جو اس کے ساتھ متصل ہے ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ہر دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کسی کے بیچ میں سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے۔“

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے جس میں ایک شخص نے کہا اے ابو عبداللہ اللہ رحمن عرش پر مستوی ہے اس کے استوی کی کیفیت کیا ہے پھر امام نے سر جھکایا اور ان کو پسینہ آنا شروع ہو گیا پھر سر اٹھایا اور کہنے لگے (یقیناً) اللہ رحمن پہلے عرش پر مستوی ہے جس طرح اپنی ذات پاک و صفت بیان فرمائی ہے اس طرح کنا ہی نہیں ہے اور کیفیت نامعلوم ہے تو بر آدمی اور صاحب البدنہ دکھائی دیتا ہے اس کو یہاں سے نکال دو امام عثمان بن سعید دارمی اپنی کتاب ”الرد علی الجہمیہ“ میں سورہ مجادلہ کی آیت کریمہ *ما یخون من نخوی کلا تیر الا جورا لبعثہم* (المجادلہ: ٤) کے متعلق وضاحت کرتے ہیں :

((انما یعنی انہ حاضر کھن نجوی ومع کل احد من فوق العرش بعلمه لان علمه بجم محیط وبصره فیه فاضل لاسمہ شیئی عن علیہ وبصره ولا یخون منہ لشیئی و یجوز کماله فوق العرش))

”یعنی اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے اوپر اپنے علم سے ہر سرگوشی اور ہر ایک کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے علم نے تمام چیزوں کو گھیرا ہوا ہے کوئی بھی چیز اس کے علم اور ان کو دیکھنے سے روک نہیں سکتی اور نہ ہی انسان اس سے بچ سکتے ہیں وہ اپنے کمال قدرت سے عرش کے اوپر ہے۔“

امام دارمی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ حاضر ناظر ہے لیکن پہلے علم اور قدرت کے لحاظ سے نہ کہ اسی طرح جس طرح بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ وہ بذات خود ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس کی تردید ہم پہلے کر چکے ہیں۔ امام حاکم نیساپوری اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث صفحہ نمبر ٨٤ پر پہلے سند سے امام ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ صاحب الصحیح سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا :

((من لم یرق ان الله تعالى على عرشه استوی فوق سبع السموات فیر بربیباب فان باب وان لا ضرب محض والحق علی بعض ذلک لیرت لای ذی السلطان والعبادون یبتغون رجحانہ وکان ما لیرت لایراد من المسلمین اذ المسلم لایرت الا فرکما قال ﷺ))

”یعنی جس آدمی نے یہ اقرار نہ کیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے تو وہ اپنے رب کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اس سے توبہ کروانی جائے گی پھر اگر توبہ کی توفیق نہ آئے اس کی گردن مادی جائے گی اور اس کو انکار گندگی کے لیے ڈھیر پھینکا جائے گا جس سے مسلمانوں یا ذمی کو اس کی بدیو تکلیف نہ پہنچانے اور اس کا مال فی بن جائے گا کوئی مسلمان اس کے مال کا وارث نہیں بنے گا کیونکہ مسلمان کا فر کا وارث نہیں بنتا جس طرح نبی ﷺ کا فرمان مبارک ہے۔

فتاویٰ راشدیہ

صفحہ نمبر 126

محدث فتویٰ

